جواب تنقید

(۲)

از جناب قدیر الدین صاحب سابق چیف جسٹس ہائی کورٹ

خطرہ کا انسداد کیا ہے؟ میرے مقالہ میں جو باتیں نمایاں کی گئی ہیں ان میں ایک بات یہ ضرور ہے کہ ۷۰ کروڑ مسلمانوں کی نمائندہ چالیس مسلمانوں کی حکومتیں رہبری کی منتظر رہ کر مایوس ہو چکی ہیں۔ اور بقول مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب "جب اُن کو کوئی اس قابل نہ ملا کہ دینی بنیادوں پر کوئی زندگی بخش اور انقلاب انگیز حرکت برپا کرتا تو اُن کی رہنمائی سے مایوس ہو کر اُمت کے بے چین طبقے اُس نظامِ زندگی کی طرف متوجہ ہو گئے جو صریحاً کامیاب نظر آ رہا ہے۔" وہ سب کے سب فقیہہ اور محدث تو بن نہیں سکتے۔ البتہ کلام پاک پڑھ سکتے ہیں اور اُس کے سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ کیا صدیقی صاحب یہ چاہتے ہیں کہ وہ یہ بھی نہ کریں؟ مگر مشکل یہ ہے کہ ذرا آگے بڑھیں تو ہر طرف اختلافات کی ایک وادئ بے پایاں ہے۔ اس میں سے گزرنا خود علماء کے لیے جس قدر مشکل ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ترکی عہد عثمانیہ میں جس کمیٹی کے سپرد مجلۂ احکام عدلیہ مرتب کرنے کا کام کیا گیا تھا اُس نے اپنی رپورٹ مورخہ یکم محرم ۱۲۸۶ھ یعنی اب سے سو برس پہلے تحریر کیا ہے کہ:-

"ظاہر ہے کہ علم فقہ ایک بحر ناپیدا کنار ہے خصوصاً فقہ حنفی میں سے مسائل کی تلاش بہت ہی دشوار ہے۔ کیونکہ بہت سے مجتہدین نے جن کے مدارج متفاوت تھے فقہ میں کام کیا ہے۔ ان میں بہت سے اختلاف ہیں اور مزید برآں اُن میں فقہ شافعی کی طرح کوئی عمل تنقیح نہیں ہوا ہے بلکہ آج تک مختلف اقوال دفتا دلے بکھرے ہوئے اور اُلجھے ہوئے پڑے ہیں۔ ان مختلف اقوال و مسائل میں سے صحیح قول تلاش کرنا اور پیش آمدہ صورت حال پر اس کی تطبیق بے انتہا مشکل کام ہے۔ اس پر مزید مشکل یہ ہے کہ جن مسائل کی بنیاد عادات و رواج پر قائم ہوتی ہے۔ وہ امتداد ایام کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔"

کتنے فقیہہ ایسے ہوتے ہیں جو مسائل فقہ پر ہر حیثیت سے ماہرانہ نظر رکھتے ہوں اِس کے متعلق آگے چل کر رپورٹ میں تحریر ہے کہ:-

" اور آج کل (یعنی اب سے سو برس پہلے، تو (دولت عثمانیہ میں) ایسے عالم ہی بہت نادر ہیں جو مسائل فقہ پر ہر حیثیت سے ماہرانہ نظر رکھتے ہوں"۔

فقہ اور اس کے ماہرین کی یہ کیفیت ہونے کے باوجود مجلۂ احکام عدلیہ تیار کیا گیا جس کا تعلق کل فقہی مسائل کے ایک تھوڑے سے جزو سے ہے۔ مگر کچھ عرصہ بعد اُس مجلہ کو بھی منسوخ کر دیا گیا۔ اب وہ کسی اسلامی مملکت میں نافذ نہیں ہے۔ آخر کیوں؟ صدیقی صاحب فرمائیں گے کہ سب اہلِ اقتدار اپنے ایمان کی خبر لیں۔ مگر اُن کے لیے رَاہبر بھی کوئی ہے؟ ایک طرف کلام پاک سے استفادہ کرنے میں بقول صدیقی صاحب خطرہ ہے۔ دوسری طرف فقہائے اُمت جماعتوں میں منقسم ہیں۔ اور لعن طعن میں مشغول ہیں۔ اس وقت یعنی بیسویں صدی میں جو کیفیت ہے، اس کا ایک خاکہ تو مولانا ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے اُس تقریر میں پیش کیا ہے جس کو اُوپر نقل کیا گیا ہے۔ مولانا صاحب کی تقریر مورخہ ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن پاک کے نقطۂ نظر سے گھبراہٹ کیوں ہے۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

" ہماری عربی درسگاہوں میں بھی ایک مدت دراز سے یہ غلط طریقہ چلا آرہا ہے کہ تعلیم کی ابتداء فقہ سے کی جاتی ہے۔ پھر ہر مذہب (اسکول) کے لوگ اپنے مخصوص فقہی نقطۂ نظر سے حدیث پڑھاتے ہیں۔ اور قرآن کی صرف ایک یا دو سورتیں محض تبرکاً داخل درس کر دی جاتی ہیں۔ بلکہ ان میں کلام الٰہی کی ادبی خوبیوں کے سوا کسی اور چیز کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جو فضلاء ان درسگاہوں سے نکلتے ہیں وہ قانون کے جزئیات و فروغ سے تو خوب واقف ہوتے ہیں مگر جس دین کو قائم کرنے کے لیے یہ قانون بنایا گیا اس کے مجموعی نظام، اس کے مقاصد، اس کے مزاج اور اس کی رُوح سے بڑی حد تک نابلد رہتے ہیں ...... وہ قانونی جزئیات اور اپنے مذہبِ خاص کے فروعی مسائل ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھے ہیں"۔

اگر دین اور اس کے مجموعی نظام سے یہی نابلدی ہو تو تعجب نہیں کہ قرآن کریم کا ابدی، آفاقی اور سرمدی پیغام ایک سازش نظر آنے لگے۔ معلوم نہیں کہ سازش کلام پاک کے اصولوں اور جوہری تصورات کا بیان ہے یا وہ ذہنیت ہے جس کے عیوب دُور کرنے کے لیے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے تجاویز پیش کرنے کے بعد مذکورہ بالا تقریر میں فرمایا کہ جب تک اُن پر عمل نہ ہو تو:

" نہ تو فقہ کا پورا فہم پیدا ہو سکتا ہے۔ نہ ان کے اندر (جو اس طرح مطالعہ کرتے ہیں) وہ اجتہادی

صلاحیتیں اُبھر سکتی ہیں جو اعلیٰ درجہ کے قاضی اور مفتی بننے کے لیے ناگزیر ہیں۔ اور نہ ان کے اندر ایسے ماہرین نکل سکتے ہیں۔ جو ہماری ترقی پذیر ریاست کی روزافزوں ضروریات کے لیے تعبیر و قیاس اور اجتہاد و استحسان کے صحیح طریقے استعمال کر کے قوانین بنا سکیں۔"

جب یہ مشکلات ہیں تو ان کا حل یہ تو نہیں ہے کہ "خالص قرآنی نقطۂ منظر" کو خطرناک اور سازشی ٹھہرایا جائے۔ صدیقی صاحب مانیں یا نہ مانیں میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ اللہ اور اس کا کلام سب سے پہلے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اللہ اور کلام اللہ کے متبع تھے۔ چنانچہ حل یہ ہے کہ کلام پاک کو سنّتِ رسول اللہ سے سمجھا جائے اور سنّتِ رسول اللہ کو قرآن پاک کے نقطۂ نظر سے سمجھا جائے۔ تاکہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ربط کلامِ پاک سے صاف سمجھ میں آجائے اور کلام اللہ کا ابدی، آفاقی اور سرمدی پیغام روز روشن کی طرح اس میں چمکتا نظر آنے لگے۔ اور اس طرح سنتِ رسول اللہ اس کا عملی پیکر دکھائی دینے لگے۔ اس کے بجائے اس پر اصرار درست نہیں کہ خالص قرآنی نقطۂ نظر کو سازش بنا دیا جائے ؎

گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

قرآن کو آنکھوں سے لگانے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ میں بقولِ اقبال اس کا بھی قائل ہوں کہ:۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

مگر اس میں اور پہلے شعر میں تضاد نہیں ہے۔ دوسرے شعر کی بنیاد اور اساس کلام پاک ہی پر ہے۔ محمد تو بہت ہوئے اور ہوں گے۔ مگر ہمارا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو وہی ہے جو کلام اللہ کے ارشاد کے مطابق اللہ کا رسول ہے۔ میرے نزدیک خطرہ اس میں ہے کہ اس کو چھوڑ دیا جائے۔ اگر صدیقی صاحب مجھ سے اس میں متفق نہیں تو میں یہ نہیں کہتا کہ نیت میں فتور ہے بلکہ قصور ہمارے دائرۂ علم اور ہماری وسعتِ عقل کا ہے۔ جس کو ہم آپس میں طے نہیں کر سکتے۔ یہ فرق گرماگرمی سے نہیں نکل سکتا اور نہ لفظی موشگافیوں سے۔ یہ اختلاف اگر اس دنیا میں دُور ہو سکتا ہے تو کسی مومن کی ایسی نگاہ سے جس سے بقولِ اقبال "بدل جاتی ہیں تقدیریں"۔ سازش اور بدنیتی کے الزام دلوں میں گرہ ڈال سکتے ہیں۔ دلوں کو صاف نہیں کر سکتے۔

اُمّتِ مسلمہ کا مسئلہ ارتقا ہے وقتی چھاپ کی بحث نہیں ہے

اُوپر ذکر ہو چکا ہے کہ صدیقی صاحب نے منکرینِ حدیث کے اس نظریے کی کہ سُنّتِ رسول اللہ پر وقتی چھاپ تھی سختی سے مخالفت کی ہے مجھے اُس کی

شکایت نہیں ۔ میں پھر عرض کر دوں کہ میں سُنّتِ رسولؐ اللہ کو پوری پوری طرح دین کا ماخذ مانتا ہوں ۔ البتہ صدیقی صاحب کے طعن و تشنیع کے باوجود یہ سمجھتا ہوں کہ جس قول، فعل یا تقریر کو سُنّت رسول اکرمؐ بتایا جائے وہ آنحضرتؐ کی سُنت ثابت ہو اور اس کو سمجھ کر اس کا اتباع کیا جائے ۔ اس سے غالباً صدیقی صاحب بھی انکار نہیں کریں گے رہی وقت کی چھاپ کی بحث تو اس کی بنیاد دراصل اُنہی بے چین طبقوں کی بے چینی ہے جن کے متعلق مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ وہ رہبری سے مایوس ہو جاتے ہیں ۔ اور دنیائے اسلام کی ارتقاء کی تمنا کرتے ہیں ۔ یہی ہے وہ ذہنیت جو منکرینِ سنّت کی محرک ہے ۔ اگر ارتقائے ملّت کی رہبری مہیا ہو جائے اور مذہبی بنیادوں پر کوئی زندگی بخش اور انقلاب انگیز حرکت برپا کر دی جائے ۔ تو منکرین سنّت بھی خاموش ہو جائیں گے ان میں بھی نیک نیت ہیں اور رسول اکرمؐ کی محبت سے سرشار ہیں ۔ لیکن اگر ارتقاء کی عملی راہ بتانے کی بجائے بدنیت اور بے ایمان کہا جائے تو اُن کا یقین اور زیادہ پختہ ہو جاتا ہے کہ مسیحائی کے دعویداروں کے پاس کوئی نسخۂ حیات نہیں ۔ اگر اُن سے یہ کہا جائے کہ درحقیقت تمہارا کوئی خاص مسئلہ ہی نہیں یہ تو ساری بناوٹی چیخ پکار ہے تو وہ معالجوں کو بے خبر اور نادان بھی سمجھنے لگتے ہیں اور معالجوں پر سے بھروسہ اُٹھ جاتا ہے ۔ اس لیے صحیح نقطۂ نظر یہ ہے کہ وقتی چھاپ کی بحث کو چھوڑ کر اُمت کے ارتقاء کے مسئلہ پر توجہ کی جائے ۔ جو بات تسلیم کرنی چاہیے وہ یہ ہے کہ ساری اُمت کا مسئلہ ارتقاء کا مسئلہ ہے ۔ اور ہمیشہ سے رہا ہے ۔ چنانچہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ۶ جنوری ۱۹۴۸ء کی تقریر میں فرمایا کہ :۔

" روزمرہ پیش آنے والے معاملات میں تعبیر و قیاس اور اجتہاد و استحسان کے ذریعہ سے اس قانون کا ارتقاء اوّل روز ہی سے شروع ہو گیا تھا "

مزید فرمایا کہ :۔

" پھر جن بنیادوں پر اسلامی قانون کا ارتقاء ہوتا ہے ۔ انہیں دیکھتے ہوئے کوئی صاحبِ علم آدمی اس امر میں شک نہیں کر سکتا کہ جس طرح پچھلی بارہ صدیوں میں یہ قانون ہر دَور اور ہر ایک ملک کی ضروریات کے مطابق وسیع ہوتا رہا ہے ۔ اسی طرح موجودہ صدی میں بھی ہو سکتا ہے "۔

یہ بات کھل کر سامنے آ جانے کے بعد وسعتِ نظر کوئی خطرناک چیز نہیں رہتی نہ اس میں کوئی سازش ہے ۔ بلکہ اس دور کی ضروریات کے مطابق ارتقاء ہو سکتا ہے ۔ اور ہونا چاہیے ۔ جو بات باقی رہتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ارتقاء کی صحیح اور عملی راہیں بتائی جائیں تاکہ اس دور کی ضروریات کے مطابق ارتقاء ہو جائے ۔ فقط اس سے

تو کام نہیں چلتا کہ یہ بھی نہ کرو، وہ بھی نہ کرو۔ یہ بھی تو بتائیے کہ جو معاملات درپیش ہیں ان کو کس طرح حل کیا جائے؟ اور وہ ایسا حل ہو جو سمجھ میں آجائے اور اطمینان بخش ہو۔ اگر سمجھ میں آجائے اور اطمینان بخش ہو تو میری عرض پھر یہ ہے کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی حکومتیں دلوا نی تو نہیں کہ خواہ مخواہ ان کی طرف سے منہ موڑ لیں۔ وہ اچھے مسلمان نہ سہی۔ مگر ان کا بگڑتا کیا ہے کہ کام بھی چل جائے اور کروڑوں مسلمان خوش اور مطمئن بھی ہو جائیں؟

مگر ان پر پھبتیاں الگ اڑائی جاتی ہیں اور یہ بات خود معرضِ بحث میں پڑ جائے کہ دَورِ حاضر کی کوئی ضروریات ہیں بھی یا نہیں۔ اگر ہیں تو کیا ہیں؟ اور ان کو کون بتا سکتا ہے؟

تو یہ مسئلہ اقتدار کی کشمکش میں پڑ جاتا ہے۔ اور بجائے دینی ہونے کے سیاسی بن جاتا ہے۔ یہ طریقہ دین کو سیاست بنانے کا ہے۔ اور پھر اس پر غصہ کرنا کہ ہم ایمان والے ہیں اور تم اپنے ایمان کی خبر لو دین کی عظمت میں خلل پذیر ہوتا ہے۔ اگر کوئی سیاسی اکھاڑے میں آئے اور یہ کہے کہ میری مان جاؤ میں سب کچھ کر کے دکھا دوں گا تو یہ دعویٰ نہ سیاست میں رہتا ہے اور نہ دین میں۔ اس وقت یہ سوال ضرور اُٹھے گا کہ پہلے ہمیں بتا دیجیے کہ آپ کے پاس کیا حل ہے۔ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ پہلے تم اپنے ایمان کی خبر لو تو فریق مخالف بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ بھی ایک سیاسی پارٹی بن کر آئے ہیں۔ آپ کی نیت ثابت سہی کم از کم اپنا حل تو پیش کیجیے اور ہم کو اطمینان دلائیے۔ ہر دینی رہبر یہ تو امید نہیں کر سکتا کہ اس پر بھروسہ اس طرح کیا جائے کہ گویا وہ رسولِ خدا کا جانشین ہے۔ اور رسالت کی ساری حکمت اس میں حلول کر آئی ہے۔ جو کچھ اعتبار کیا جانا چاہیے وہ بھی پارٹیوں، فرقہ بندیوں اور جماعتوں کی فراوانی سے معرضِ بحث میں پڑ جاتا ہے۔

بات دہیں آکر رک جاتی ہے کہ پہلے ارتقاء کی ضرورت کو تسلیم کیجیے۔ اور اس کا حل پیش کیجیے۔ بات چند لفظوں میں یہ ہے کہ پہلے بھروسہ پیدا کرنا ضروری ہے۔

اسلام کی کامیابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر بھروسہ سے ہوئی۔ اور ان کی پے در پے کامیابیاں اس بھروسہ کو ہر روز بڑھاتی رہیں۔

مجھ سے ایک براہ راست استفسار پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب اس طرف آنا ہی نہیں چاہتے۔ بہر حال انہوں نے مجھ سے ایک بات دریافت کی ہے۔ یہ ان کی طرف سے میری عزت افزائی ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔

یوں تو پروفیسر صاحب کے سارے "اشارات" جواب طلب ہیں ان کا جواب دینے کے لیے دفتر چاہیے اور ایک عمر بھی۔

میں نے حکیم محمد سعید صاحب کی فرمائش سے اچھا کام سمجھ کر مقالہ لکھا - اب پروفیسر صاحب کی فرمائش تو ترجمان القرآن کی مئی ۵۷ء کی اشاعت میں چھپ گئی ہے - ان کے آخری سوال کے متعلق جو کچھ سمجھ سکتا ہوں عرض کیے دیتا ہوں - اگر پروفیسر صاحب اتفاق نہ کریں تو خفا نہ ہوں کیونکہ میں عمر بھر ایک طالب علم رہا ہوں - پروفیسر نہیں ہوں -

پروفیسر صاحب نے سوال اس طرح کیا ہے کہ :-

"جسٹس صاحب اس ملک میں علمی اعتبار سے ایک نامور ہستی ہیں - اور وہ قانونی اصطلاحات اور ان کے مضمرات سے بخوبی واقف ہیں - ہم ان سے یہ دریافت کرنے کی جسارت کرتے ہیں کہ کیا تفویض کردہ محدود حاکمیت اور اصل حاکمیت ایک دوسرے کے مدمقابل موقف ہیں ؟ کیا حاکم اعلیٰ کی نیابت کے معنی اس کی حاکمیت میں بے جا مداخلت اور شرکت ہیں ؟ دنیا میں تو آج تک نیابت کا یہی مفہوم سمجھا جاتا رہا ہے کہ جو فرد گروہ یا ادارہ نیابت کا منصب قبول کرتا ہے - وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ اصل حاکم کا نائب اور خلیفہ ہے - جسے اس کے عطا کردہ دائرہ اختیار میں حاکم حقیقی کے منشاء کو ہی پورا کرنا ہے - یہ راز ہم پر آج جسٹس صاحب کی نکتہ آفرینی سے کھلا ہے کہ نیابت اصل حاکم کے خلاف بغاوت اور سازش کا منصب ہے "

یہ سوال اس ارشاد گرامی کے بعد اُٹھایا گیا ہے کہ :-

"جسٹس صاحب کا یہ خیال بھی نرالا ہے کہ اگر مسلمان اپنے احاطہ اقتدار میں خدا کی حاکمیت تسلیم کرتے ہوئے ان اجتماعی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں جو کائنات کے فرمانروائے حقیقی کی طرف سے اُن پر عائد ہوتی ہیں تو وہ شرک جیسے گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوں گے - کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان اور کائنات پر اپنی حاکمیت غیر مرئی قوانین کے ذریعہ مسلط کر رکھی ہے - اب اگر مسلمان اس حاکمیت کو مرئی ضابطوں کی مدد سے کسی معاشرے پر قائم کریں تو یہ حاکمیت الٰہی میں شرکت کے مترادف ہے - اور اس آسمان کے نیچے اس سے زیادہ سنگین جرم کا تصور نہیں کیا جاسکتا "

پروفیسر صاحب نے مذکورہ بالا عبارت بغیر کسی حوالے کے تحریر کی ہے - نہ میرے مقالہ کا صفحہ درج کیا اور نہ میری عبارت پیش کی - اس لیے میں خوشی سے اس "نرالے تصور" اور اس "نقطہ آفرینی" کے سہرے کو اپنے سر سے اُتار کر انہی کے سر سے باندھے دیتا ہوں - وہی اس کے حقدار ہیں کیونکہ یہ عبارت میری قطعی نہیں ہے - میں اس سے

مُبرا ہوں۔

اب میں کیا جواب دوں ؟ اگر خود تلاش کروں کہ یہ " نرالا تصور" اور یہ " نقطۂ آفرینی " کہاں سے پیدا ہوئی تو مجھے کیا معلوم کہ میں کچھ سوچوں اور پروفیسر صاحب اس کے علاوہ کسی اور طرف " اشارات" کا رُخ کر دیں۔

بس یہ بیان کر سکتا ہوں کہ تفویض اور نیابت کا میرے نزدیک مختصراً کیا تصوّر ہے۔ تفصیل میں تو مستقل کتب موجود ہیں۔ اجمالاً عرض ہے کہ اوّل تو تفویض اور نیابت کملاً ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ تفویض میں سپردگی پائی جاتی ہے اور نیابت میں قائم مقامی۔ دوسرے یہ کہ دونوں الفاظ میں سے کسی میں بھی یہ معنی نہیں پائے جاتے کہ جس نے اپنا نائب یا قائم مقام بنا دیا وہ خود دست بردار ہو گیا۔ چنانچہ تیسری بات یہ پائی جاتی ہے کہ تفویض اور نیابت دونوں میں سے کسی کے ذریعے سو فیصدی اختیارات نہیں بلکہ محدود اختیارات منتقل ہوتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی وسیع ہوں۔ چوتھی چیز یہ ہے کہ قائم مقام یا نائب اگر ان حدود سے تجاوز کرے جو مقرر کر دی گئی ہیں تو وہ خلاف ورزی کرتا ہے۔ معاشی و معاشرتی تعلقات اور سیاست مدنیہ میں تو نائبوں اور قائم مقاموں کی خلاف ورزیاں مشہور ہیں۔ جب کوئی شخص اُس دائرۂ اختیار سے بڑھ جائے جو اللہ کی طرف سے کھینچا گیا ہے تو وہ اللہ کی منشا کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زیادہ سے زیادہ چھ خلاف ورزیوں کی سزا دُنیا میں مقرر کی ہے اور ان کی باز پُرس آخرت میں بھی ہے۔ مثلاً چوری اور رہزنی۔ خدا کی منشا کی باقی ساری خلاف ورزیوں کی باز پُرس آخرت میں ہے۔ نیز کوئی خلاف ورزی ایسی نہیں ہے جس کی سزا اللہ کی طرف سے دنیا میں مقرر کی گئی ہو۔ مگر اس کی باز پُرس آخرت میں نہ ہو۔ یہ کوئی نہیں کہتا اور نہ درست طور پر کہہ سکتا ہے کہ دنیا کی باز پُرس اور آخرت کی باز پُرس ایک ہی چیز ہے۔ اگر سہولت کے لیے ملکی قانون کی اصطلاح استعمال کی جائے تو کہا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں اختیاراتِ سماعت علیحدہ ہیں۔ دُنیا کا اختیار صرف جسم پر چلتا ہے۔ اِس کے معنی یہ نہیں کہ دوئی ہے۔ بلکہ ایک ہی انتظام اعلیٰ کے دو پہلو ہیں۔ مثلاً شاہ ولی اللہ صاحب " ہمات " میں فرماتے ہیں :۔

> " دینِ محمدی کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ جہاں تک دین کی ظاہری حیثیت کا تعلق ہے اُس کا مقصود مصلحتِ عامہ کی نگہداشت اور اس کی دیکھ بھال ہے۔"

چنانچہ ظاہر ہے کہ اللہ کے دنیا اور آخرت کے ہمہ گیر اختیارات اور فقط دنیا کے انتظام و انصرام کا اختیار ایک چیز نہیں۔ نیز اللہ جب کسی کو دنیا میں حکومت دیتا ہے تو وہ حاکم اللہ کا محکوم ہوتا ہے۔ وہ یہ نہ سمجھے

کہ وہ اللہ کا سہیم و شریک بن گیا - اللہ کی حکومت میں کوئی شریک و سہیم نہیں ہے (بقرہ ۲۵ : ۲) - اگر دنیاوی حاکم ایسا سمجھے تو وہ اللہ کے دیے ہوئے اختیارات کی حدود سے تجاوز کرتا ہے - مثلاً اللہ نے اسلام نہ لانے کی کوئی دُنیاوی سزا مقرر نہیں کی ہے - اگر کوئی حاکم غیر مسلموں کو محض اس وجہ سے قتل کرنے لگے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں - اور اس قتل سے کسی دُنیاوی جرم اور اس ضمن میں کسی دنیاوی قانون کا تعلق نہ ہو تو وہ اپنے دائرۂ اختیار سے تجاوز کرے گا اور اُس کا جواب دہ ہوگا - رہی اس حاکم کی بات جو اپنے حدود میں رہتا ہے تو اس پر خلاف ورزی کا سرے سے الزام ہی نہیں - اگر الزام ہو تو جیسی اس کی نوعیت ہوگی ویسا اس کا نتیجہ نکالا جائے گا - یہ ضروری تو نہیں کہ ہر ایک مجتہد، مجتہد مطلق ہو - مگر میں نے تو کسی قسم کا مجتہد ہونے کا بھی دعوٰی نہیں کیا - البتہ اسلامی، ملکی اور مغربی قانون کے مطالعہ میں میری عمر کے چالیس سے زیادہ سال بسر ہوگئے ہیں - میں نے جو کچھ عرض کیا ہے - وہ پروفیسر صاحب کی فرمائش سے ہے - اُنہوں نے ہی مجھے اس قابل تصور فرما کر عنایت فرمائی ہے -

میرے مقالہ کا لُب لباب | پروفیسر صاحب نے اپنے مضمون کے دوران میں ایک آدھ دفعہ مجھ سے اتفاق کیا ہے - مئی کے پرچے میں صفحہ ۱۰۶ پر فرمایا ہے کہ :-

"جسٹس صاحب کے پورے مقالہ کا لُب لباب یہ ہے کہ قرآن مجید اسلامی ریاست کے قیام کا قطعاً داعی نہیں - اجتماعی معاملات میں اُس کا مقصد یہ ہے کہ اس کرۂ ارض کو پختہ سیرت و کردار رکھنے والے افراد سے معمور کر دے - جسٹس صاحب نے جو بات ارشاد فرمائی ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

یہ اتفاق کیا کم ہے کہ سارے مقالہ کے لُب لباب کو چند الفاظ میں خوبصورتی سے بیان کر دیا ہے اور پھر اُس سے اتفاق کر لیا - اب بچا کیا ؟ مگر اس کے بعد فرماتے ہیں کہ :-

" لیکن فاضل مقالہ نگار کے موقف اور طرزِ استدلال کا اگر دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے تحت الشعور میں دین اور سیاست کی دُوئی کا وہی تصور کار فرما ہے جو اہلِ یورپ کے دماغ پر مستولی ہے ۔"

پروفیسر صاحب یہ بھی کر سکتے تھے کہ میرے مقالہ کا جو لُب لباب ہے اس کی تائید مجھ سے زیادہ اچھے طریقہ پر کرتے - اس کے لیے بہتر سے بہتر دلائل پیش کرتے - مگر انہوں نے یہ طرز اختیار نہیں کیا بلکہ میری ذات اور میری دماغی کیفیت پر متوجہ ہو گئے - اور جو جو قلم سے نکلا لکھتے چلے گئے - رسول اکرمؐ کے ارشاد کی وہ روایت تو

ان کی نظر میں ہوگی جس کو مولانا حالیؔ نے ان الفاظ میں منظوم کیا ہے کہ:-

حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو

میرا مطلب یہ نہیں کہ میں نے کوئی حکمت کی بات کہی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی صحیح بات میرے منہ سے نکل گئی تو میرے منہ کی طرف کیوں دیکھتے ہیں؟ بات کو سُنئے۔ مگر پروفیسر صاحب کو میرے تحت الشعور تک پہنچ کر بات ہی کو بگاڑنا منظور ہوا۔ میرے دل کے رازداں بن کر مجھ سے بدظنی اس بنا پر کی کہ طرزِ استدلال ناپسند ہوا۔ مگر بدظنی کی بھی حد ہوتی ہے۔ کبھی روایات سُن کر ہوگئی تو کبھی مقالہ کی اعلیٰ طباعت دیکھ کر۔

ان کے اور میرے طرزِ استدلال میں تو فرق ہونا لازمی ہے۔ اگر طرز کی وجہ سے بدظنی کرنا جائز ہوتا تو مجھے بھی ان سے اور ان کی نیّت سے بدظنی کرنے کا حق ہوگیا ہوتا۔ مگر میں تو یہ نہیں سمجھتا۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے میں تو اسلام کی وحدت کا قائل ہوں۔ اور جن سے مجھے واسطہ پڑتا ہے وہ میرے اس اصرار کے شاکی ہیں۔ مگر پروفیسر صاحب نے میرے تحت الشعور میں دُوئی بھانپ لی اور وہ بھی وہ دُوئی جو اہل یورپ کے دماغ پر مستولی ہے۔ اب میں اُن سے کیا کہہ سکتا ہوں؟ بس دُعا یہ ہے کہ:-

ع دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زبان اور

پروفیسر صاحب سے ایک استدعا پروفیسر صاحب نے میرے مقالہ کا لب لباب صحیح اخذ فرمایا جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے۔ اسی مقصد کے لیے ایک ضرورت یہ ہے کہ جو اہلِ اقتدار ہیں ان کو اطمینان دلایا جائے کہ اسلام کے ذریعہ ارتقاء ہوسکتا ہے تاکہ وہ دین کو دُور از کار چیز نہ سمجھیں۔ یہ یقین عملی صورت پیدا کرکے دلانا دین کی شان کے خلاف نہیں ہے۔ رسول اللہؐ نے عملی طریقہ سے یہ یقین دلایا اور ایمان پختہ کیا۔ یہ کام بہت ضروری ہے اس کو نہ فقط مغرب زدہ مسلمان کر سکتے ہیں اور نہ مشرق زدہ۔ اوّل الذکر اس وجہ سے نہیں کر سکتے کہ ان میں روحانیت کی کشش ہی نہیں ہے جو دلوں پر اثر کرنے کے لیے علم سے زیادہ ضروری ہے۔ اگر وہ کوشش کرتے ہیں تو آخر الذکر طبقہ میں بدظنی بھی پھیلتی ہے۔ اور اس بات کا بھی ڈر پیدا ہوتا ہے کہ کہیں تسلسلِ ارتقاء کی بجائے درمیان میں ایک خلاء پیدا نہ ہو جائے۔ آخر الذکر اصحاب اس وجہ سے نہیں کر سکتے کہ وہ جدید ضروریات اور علومِ جدید سے کماحقہ واقف نہیں۔ صدیوں سے ان کو سیاستِ مدنیہ کا تجربہ نہیں ہے۔ نیز جیسا کہ پروفیسر صاحب کے ارشادات سے واضح ہوتا ہے۔ وہ اصحاب وسعتِ نظری کو کم از کم شدید بداحتیاطی ضرور تصور فرماتے

ہیں۔ اس لیے میں نے اپنے مقالہ کے آخری پیرے گراف میں عرض کیا تھا کہ قدیم اور جدید خیالات کے لوگوں کو مل کر اس طرف توجہ کرنی چاہیے۔ اگر یہ لوگ مل کر اس کام کو ہاتھ میں لے لیں تو بھی یہ کام آسان تو نہیں مگر پورا ہو سکتا ہے۔ سب تو اس کام میں شامل نہیں ہوں گے۔ کیونکہ یہ کام ذاتی فائدہ کا تو ہے نہیں۔ اگر تھوڑے سے بھی آپس میں اتحاد، عمل اور جستجو کریں اور تھوڑا کام بھی ہو جائے تو کم از کم آپس کا ٹکراؤ تو کم ہو گا۔ اور راستہ تو کھلے گا۔

پروفیسر صاحب نے فروری کے پرچہ میں صفحہ ۲۴ پر قرآن اور حدیث کے حوالہ سے اس بات پر زور دیا ہے کہ:۔

"اگر کوئی اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے تو سرِ تسلیم خم کرنا چاہیے۔"

یہ درست ہے مگر بلانے کا طریقہ بھی تو اللہ نے بتایا ہے۔ اور میں نے کلامِ پاک کی ایک متعلقہ آیت کریمہ اس مضمون کے عنوان کے طور پر لکھی ہے۔ میں اپنی طرف سے اسے لبیک کہتا ہوں۔ اب پروفیسر صاحب اپنے دل میں فیصلہ کر لیں کہ مجھ ناچیز کی خواہش طرز کے اختلاف کے باوجود قابل لحاظ ہے یا نہیں؟ میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور میرے طرز میں بھی فرق ہے اس لیے اگر وہ مجھ سے تعاون نہ کریں تو کم از کم یہ تو سوچیں کہ نیت پر حملے کرنا مناسب ہے یا نہیں۔ نیز کیا ساری دنیا کی حکومتوں کے اہل اقتدار کے ایمان پر حملہ کرنا ایسا ہی بلانا ہے کہ وہ سرِ تسلیم خم کر لیں؟

کسی غیر معصوم کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ خدائے جل شانہٗ نے خود اپنے محبوب خاص سے

چراغ افروزِ چشم اہلِ بینش
طرازِ کارگاہِ آفرینش

اور فخر انبیا سے فرما دیا کہ:۔

"اگر تم کہیں تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب (لوگ) تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔"

(آل عمران ۱۵۹)